© rasailojaraid.com

تفہیم القرآن

الشوریٰ

(۳)

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے[۳۴] جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے[۳۵] اور وہ بڑی
قوت والا اور زبردست ہے[۳۶]ع جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ۲ر
ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا
کوئی حصہ نہیں ہے[۳۷]۔

---

[۳۴] اصل میں لفظ لَطِیْفٌ استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم "مہربان" سے ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت و عنایت رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ اُن کی دقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے جن تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، اور انہیں اس طرح پورا کرتا ہے کہ وہ خود بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہماری کونسی ضرورت کب کس نے پوری کر دی۔ پھر یہاں بندوں سے مراد محض اہلِ ایمان نہیں، بلکہ تمام بندے ہیں، یعنی اللہ کا یہ لطف اس کے سب بندوں پر عام ہے۔

[۳۵] مطلب یہ ہے کہ اِس لُطفِ عام کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سب بندوں کو سب کچھ یکساں دے دیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے خزانوں سے دے سب ہی کو رہا ہے، مگر اِس عطا اور دین میں یکسانیت نہیں ہے کسی کو کوئی چیز دی ہے تو کسی دوسرے کو کوئی اور چیز۔ کسی کو ایک چیز زیادہ دی ہے تو کسی اور کو کوئی دوسری چیز فراوانی کے ساتھ عطا فرما دی ہے۔

[۳۶] یعنی اس کی عطا و بخشش کا یہ نظام اس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ کسی کا یہ بل بوتا نہیں ہے کہ اسے بدل سکے، یا زبردستی اس سے کچھ لے سکے، یا کسی کو دینے سے اُس کو روک سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۷ے گزشتہ آیت میں دو حقیقتیں بیان کی گئی تھیں جن کا مشاہدہ ہم ہر وقت ہر طرف کر رہے ہیں ایک یہ کہ تمام بندوں پر اللہ کا لطف عام ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی عطا و بخشش اور رزق رسانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے بلکہ اس میں فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس لطف اور رزق رسانی میں جزوی تفاوت تو بے شمار ہیں، مگر ایک بہت بڑا اصولی تفاوت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخرت کے طالب کے لیے ایک طرح کا رزق ہے اور دنیا کے طالب کے لیے دوسری طرح کا رزق۔

یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے جسے اِن مختصر الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا جائے، کیونکہ یہ ہر انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

آخرت اور دنیا، دونوں کے لیے سعی و عمل کرنے والوں کو اس آیت میں کسان سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین تیار کرنے سے لے کر فصل کے تیار ہونے تک مسلسل عرق ریزی اور جاں فشانی کرتا ہے، اور یہ ساری محنتیں اس غرض کے لیے کرتا ہے کہ اپنی کھیتی میں جو بیج وہ بو رہا ہے اس کی فصل کاٹے اور اس کے پھل سے متمتع ہو۔ لیکن نیت اور مقصد کے فرق، اور بہت بڑی حد تک طرزِ عمل کے فرق سے بھی، آخرت کی کھیتی بونے والے کسان اور دنیا کی کھیتی بونے والے کسان کے درمیان فرقِ عظیم واقع ہو جاتا ہے، اس لیے دونوں کی محنتوں کے نتائج و ثمرات بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف رکھے ہیں، حالانکہ دونوں کے کام کرنے کی جگہ یہی زمین ہے۔

آخرت کی کھیتی بونے والے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا اسے نہیں ملے گی۔ دنیا تو کم یا زیادہ بہرحال اس کو ملنی ہی ہے، کیونکہ یہاں اللہ جل شانہ کے لطفِ عام میں اس کا بھی حصہ ہے اور رزق نیک و بد سبھی کو یہاں مل رہا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے خوشخبری دنیا ملنے کی نہیں بلکہ اس بات کی سنائی ہے کہ اس کی آخرت کی کھیتی بڑھائی جائے گی، کیونکہ اُسی کا وہ طالب ہے اور اُسی کے انجام کی اُسے فکر لاحق ہے۔ اِس کھیتی کے بڑھائے جانے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً جس قدر زیادہ نیک نیتی کے ساتھ وہ آخرت کے لیے عملِ صالح کرتا جائے گا اُسے اور زیادہ نیک عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور اس کا سینہ نیکیوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ پاک مقصد کے لیے پاک ذرائع اختیار کرنے کا جب وہ تہیہ کرے گا تو اس کے لیے پاک ہی ذرائع میں برکت دی جائے گی اور اللہ اس کی نوبت نہ آنے دیگا کہ اس کے لیے خیر کے سارے دروازے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنہوں نے اِن کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا؟ ۳۸ اگر فیصلے کی بات پہلے طے نہ ہو گئی

بند ہو کر صرف شر ہی کے دروازے کھلے رہ جائیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا میں اس کی تھوڑی نیکی بھی آخرت میں کم از کم دس گنی تو بڑھائی ہی جائے گی، اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، ہزاروں لاکھوں گنی بھی اللہ جس کے لیے چاہے گا بڑھا دے گا۔

رہا دنیا کی کھیتی بونے والا، یعنی وہ شخص جو آخرت نہیں چاہتا اور سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کے دو نتائج صاف صاف سنا دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ خواہ وہ کتنا ہی سر مارے، جس قدر دنیا وہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ پوری کی پوری اسے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کا ایک حصہ ہی ملے گا، جتنا اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے جو کچھ ملنا ہے بس دنیا ہی میں مل جائیگا، آخرت کی بھلائیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

۳۸ اِس آیت میں شُرَکَاء سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ بلکہ لامحالہ اُن سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اِس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف، اور اس کے اذن (SANCTION) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، [illegible] ۱۲۴، ۱۹۲-۲۶۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی تو ان کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا[۳۹]۔ یقیناً اِن ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اُس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ ان پر آ کر رہے گا۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے اُن بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اے نبی، اِن لوگوں سے کہدو کہ میں اِس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں[۴۰]، البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں[۴۱]۔

۳۶۶-۳۶۷-۳۷۷-۴۳۴-۴۳۸-۴۹۰-۴۹۹-۵۷۷-۵۷۸-۵۸۵-۵۸۶- جلد دوم، ص ۱۸۹-۱۹۰-۲۹۲ تا ۲۹۴-۴۸۲-۴۸۳-۵۷۷-۵۷۸- جلد سوم، ص ۲۱-۶۹-۶۵۶- جلد چہارم، سبا، آیت ۲۱، حاشیہ ۶۳-یٰس، آیت ۶۰، حاشیہ ۵۳)۔

۳۹؎ یعنی اللہ کے مقابلہ میں یہ ایسی سخت جسارت ہے کہ اگر فیصلہ قیامت پر نہ اٹھا رکھا گیا ہوتا تو دنیا ہی میں ہر اُس شخص پر عذاب نازل کر دیا جاتا جس نے اللہ کا بندہ ہوتے ہوئے، اللہ کی زمین پر خود اپنا دین جاری کیا، اور وہ سب لوگ بھی تباہ کر دیئے جاتے جنہوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسروں کے بنائے ہوئے دین کو قبول کیا۔

۴۰؎ اِس کام سے مراد وہ کوشش ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خدا کے عذاب سے بچانے اور جنت کی بشارت کا مستحق بنانے کے لیے کر رہے تھے۔

۴۱؎ اصل الفاظ ہیں اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔ یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر "قُربیٰ" کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ "قُربیٰ" کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے:

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم از کم اُس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے، لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو"۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالہ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدّی، ابو مالک، عبدالرحمان بن زید بن اسلم، ضحّاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسّرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ "قربیٰ" کو قُرب اور تقرّب کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے" یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصری سے منقول ہے، اور ایک قول قتادہ سے بھی اِس کی تائید میں نقل ہُوا ہے بلکہ طبرانی کی ایک روایت میں ابن عباس کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہُوا ہے: قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا (الفرقان-۵۷)۔ "اِن سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔"

تیسرا گروہ "قربیٰ" کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو۔" پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علی و فاطمہ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبیر اور عَمرو بن شعیب سے منقول ہے، اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباس اور حضرت علی بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکہ معظمہ میں سورۂ شوریٰ نازل ہوئی ہے اُس وقت حضرت علی و فاطمہ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمطلب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ، آپ کے والد ماجد اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ کے واسطے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کوئی بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے ۔ بے شک اللہ

سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپ کی رشتہ داریاں تھیں ۔ اور ان سب گھرانوں میں آپ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی ۔ آخر حضور کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقرباء میں سے آپ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ محبت کو انہی کے لیے مخصوص رکھتے ۔ تیسری بات، جو ان سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مقام سے اِس کارِ عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اِس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی ۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ رب العلمین کے ذمہ ہے (یونس ۷۲ ۔ ہود ۲۹ ۔ ۵۱ ۔ الشعراء ۱۰۹ ۔ ۱۲۷ ۔ ۱۴۵ ۔ ۱۶۴ ۔ ۱۸۰) ۔

سورۂ یٰسٓ میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (آیت ۲۱) ۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآنِ پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ مَیں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں (الانعام ۹۰ ۔ یوسف ۱۰۴ ۔ المومنون ۷۲ ۔ الفرقان ۵۷ ۔ سبا ۴۷ ۔ ص ۸۶ ۔ الطور ۴۰ ۔ القلم ۴۶) ۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ مَیں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو ۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں ۔ اوپر سے ساری تقریر انہی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آرہی ہے، اور آگے بھی روئے سخن انہی کی طرف ہے ۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ۔ اجر تو ان لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو ۔ کفار حضور کے اِس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا ۔ وہ تو الٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بُرا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے۔ [۴۲]
کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ [۴۳] اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مُہر کر دے۔ [۴۴] وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔ [۴۵] وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔ [۴۶] وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے

---

۴۲ یعنی جان بوجھ کر نافرمانی کرنے والے مجرمین کے برعکس نیکی کی کوشش کرنے والے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ (۱) جتنی کچھ اپنی طرف سے وہ نیک بننے کی سعی کرتے ہیں، اللہ ان کو اس سے زیادہ نیک بنا دیتا ہے (۲)، ان کے کام میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، یا نیک بننے کی کوشش کے باوجود جو گناہ ان سے سرزد ہو جاتے ہیں، اللہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے، اور (۳) جو تھوڑی سی نیک عمل کی پُونجی وہ لے کر آتے ہیں اللہ اس پر ان کی قدر افزائی کرتا ہے اور انہیں زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔

۴۳ اِس سوالیہ فقرے میں سخت ملامت کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی، کیا یہ لوگ اِس قدر جری اور بے باک ہیں کہ تم جیسے شخص پر افترا، اور وہ بھی افتراء علی اللہ جیسے گھناؤنے فعل کا الزام رکھتے ہوئے اِنہیں ذرا شرم نہیں آتی؟ یہ تم پر تہمت لگاتے ہیں کہ تم اس قرآن کو خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو؟

۴۴ یعنی اتنے بڑے جھوٹ صرف وہی لوگ بولا کرتے ہیں جن کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔ اگر اللہ چاہے تو تمہیں بھی اُن میں شامل کر دے۔ مگر اُس کا یہ فضل ہے کہ اُس نے تمہیں اس گروہ سے الگ رکھا ہے۔ اِس جواب میں اُن لوگوں پر شدید طنز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام رکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی، ان لوگوں نے تمہیں بھی اپنی قماش کا آدمی سمجھ لیا ہے۔ جس طرح یہ خود اپنی اغراض کے لیے ہر بڑے سے بڑا جھوٹ بول جاتے ہیں، انہوں نے خیال کیا کہ تم بھی اُسی طرح اپنی دوکان چمکانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لائے ہو۔ لیکن یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تمہارے دل پر وہ مہر نہیں لگائی ہے جو اِن کے دلوں پر لگا رکھی ہے۔

۴۵ یعنی یہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائیداری نہیں بخشتا اور آخر کار حق کو حق ہی کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اسے علم ہے۔[۴۶] وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دُعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے۔ رہے انکار کرنے والے، تو ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور اُن پر نگاہ رکھتا ہے۔[۴۸] وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ

دکھا دیتا ہے۔ اس لیے اے نبی، تم ان جھوٹے الزامات کی ذرہ برابر پروا نہ کرو، اور اپنا کام کیے جاؤ۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اڑ جائے گا اور جس چیز کو تم پیش کر رہے ہو اس کا حق ہونا عیاں ہو جائے گا۔

[۴۶] یعنی اُس کو معلوم ہے کہ یہ الزامات تم پر کیوں لگائے جا رہے ہیں اور یہ ساری تگ و دو جو تمہیں زک دینے کے لیے کی جا رہی ہے، اِس کے پیچھے درحقیقت کیا اغراض اور کیا نیتیں کام کر رہی ہیں۔

[۴۷] پچھلی آیت کے معاً بعد توبہ کی ترغیب دینے سے خودبخود یہ مضمون نکلتا ہے کہ ظالمو، سچے نبی پر یہ جھوٹے الزامات رکھ کر کیوں اپنے آپ کو اور زیادہ خدا کے عذاب کا مستحق بناتے ہو، اب بھی اپنی اِن حرکتوں سے باز آجاؤ اور توبہ کر لو تو اللہ معاف فرما دیگا۔ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کیے پر نادم ہو، جس بُرائی کا وہ مرتکب ہُوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے فوراً باز آجائے، اور آئندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز یہ بھی سچی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو بُرائی کسی شخص نے پہلے کی ہے اُس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پُوری کوشش کرے، اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس دھبّے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا ہے لیکن کوئی توبہ اُس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔

[۴۸] جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُسے نظر میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے، اور وہی قابلِ تعریف ولی ہے[49]۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں[50]۔ وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے[51]۔ ع تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے[52]۔ تم زمین میں

ہے کہ یہاں دراصل اللہ تعالیٰ اُس بنیادی سبب کی طرف اشارہ فرما رہا ہے جو کفارِ مکہ کی سرکشی میں کام کر رہا تھا۔ اگرچہ روم و ایران کے مقابلہ میں ان کی کوئی ہستی نہ تھی اور گرد و پیش کی قوموں میں وہ ایک پس ماندہ قوم کے ایک تجارت پیشہ قبیلے، یا بالفاظِ دیگر، بنجاروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اپنی اس ذرا سی دنیا میں ان کو دوسرے عربوں کی بہ نسبت جو خوشحالی اور بڑائی نصیب تھی اُس نے اُن کو اتنا مغرور و متکبر بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی بات پر کان دھرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے، اور ان کے سرداران قبائل اِس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پیشوا ہوں اور وہ اُن کی پیروی کریں۔ اِسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کہیں ہم اِن چھوٹے ظرف کے لوگوں پر واقعی رزق کے دروازے کھول دیتے تو یہ بالکل ہی پھٹ پڑتے، مگر ہم نے اِنہیں دیکھ کر ہی رکھا ہے، اور ناپ تول کر ہم انہیں بس اُتنا ہی دے رہے ہیں جو اِن کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔ اِس معنی کے لحاظ سے یہ آیت دوسرے الفاظ میں وہی مضمون ادا کر رہی ہے جو سورۂ توبہ، آیات ۶۸ ـ ۷۰، الکہف، آیات ۳۲ ـ ۴۲، القصص، آیات ۷۵ ـ ۸۲، الروم، آیت ۹، سبا، آیت ۳۴ ـ ۳۶ اور المومن آیات ۸۲ ـ ۸۵ میں بیان ہوا ہے۔

[49] یہاں ولی سے مراد وہ ہستی ہے جو اپنی پیدا کردہ ساری مخلوق کے معاملات کی متولی ہے جس نے بندوں کی حاجات و ضروریات پوری کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔

[50] یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔ یہ کھلا اشارہ ہے اِس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیاروں میں بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں۔

[51] یعنی جس طرح وہ انہیں پھیلا دینے پر قادر ہے اُسی طرح وہ انہیں جمع کر لینے پر بھی قادر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو، اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اللہ جب چاہے ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ۔۔۔ اِس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو۔[۵۵] ۔۔۔ یا (اُن پر سوار ہونے

لہٰذا یہ خیال کرنا غلط ہے کہ قیامت نہیں آسکتی اور تمام اوّلین و آخرین کو بیک وقت اٹھا کر اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔

[۵۳] واضح رہے کہ یہاں تمام انسانی مصائب کی وجہ بیان نہیں کی جارہی ہے، بلکہ روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اس وقت مکہ معظمہ میں کفر و نافرمانی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اُن سے فرمایا جارہا ہے کہ اگر اللہ تمہارے سارے قصوروں پر گرفت کرتا تو تمہیں جیتا ہی نہ چھوڑتا، لیکن یہ مصائب جو تم پر نازل ہوئے ہیں (غالباً اشارہ ہے مکہ کے قحط کی طرف)، یہ محض بطورِ تنبیہ ہیں تاکہ تم ہوش میں آؤ، اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلے میں تم نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس خدا سے تم بغاوت کر رہے ہو اس کے مقابلے میں تم کتنے بے بس ہو، اور یہ جانو کہ جنہیں تم اپنا ولی و کارساز بنائے بیٹھے ہو، یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے وہ اللہ کی پکڑ سے بچانے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتیں۔

مزید توضیح کے لیے یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جہاں تک مومنِ مخلص کا تعلق ہے اس کے لیے اللہ کا قانون اِس سے مختلف ہے۔ اس پر جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی آتی ہیں وہ سب اس کے گناہوں اور خطاؤں اور کوتاہیوں کا کفارہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ مَا یُصِیبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حزنٍ ولا اذًی ولا غمٍّ حتی الشوکۃ یُشَاکُہا الا کفّر اللہ بہا من خطایاہ (بخاری و مسلم) "مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے، حتیٰ کہ ایک کانٹا بھی اگر اس کو چبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفارہ بنا دیتا ہے"۔ رہے وہ مصائب جو اللہ کی راہ میں اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کوئی مومن برداشت کرتا ہے، تو وہ محض کوتاہیوں کا کفارہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ہاں ترقیِ درجات کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والوں کے بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے، اور اُس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے؀۵۳۔

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے؀۵۵، اور جو کچھ اللہ

وہ گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتے ہیں۔

؀۵۳ "صبر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور بُرے تمام حالات میں بندگی کے رویّے پر ثابت قدم رہے جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے، اور بُرا وقت آجائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اُتر آئے۔ "شکر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیر الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اٹھا لے جائے، وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں، اور خوشحالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

؀۵۴ قریش کے لوگوں کو اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں حبش اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی طرف بھی جانا ہوتا تھا، اور ان سفروں میں وہ بادبانی جہازوں اور کشتیوں پر بحر احمر سے گزرتے تھے جو ایک بڑا خطرناک سمندر ہے۔ اس میں اکثر طوفان اٹھتے رہتے ہیں اور زیر آب چٹانیں کثرت سے ہیں جن سے طوفان کی حالت میں ٹکرا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس کیفیت کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کھینچا ہے اسے قریش کے لوگ اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں پوری طرح محسوس کر سکتے تھے۔

؀۵۵ یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے، ایک تھوڑی سی مدت ہی کے لیے ملی ہے۔ چند سال وہ اُس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دولت بھی چاہے بہی کھاتوں میں کتنی ہی بڑی ہو، عملاً اس کا ایک قلیل سا حصہ ہی آدمی کے اپنے استعمال میں آتا ہے۔ اس مال پر اِترانا کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔[۵۶] وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں،[۵۷] جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں[۵۸] اور اگر غصّہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں،[۵۹] جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں،[۶۰] نماز قائم

ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنی اور اِس مال و دولت کی، اور خود اِس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔

[۵۶] یعنی وہ دولت اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اور پھر وقتی و عارضی بھی نہیں ہے بلکہ ابدی اور لازوال ہے۔

[۵۷] اللہ پر توکل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔ توکّل کے معنی یہ ہیں کہ: اوّلاً، آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اخلاق کے جو اصول، حلال و حرام کے جو حدود، اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیئے ہیں وہی برحق ہیں اور انہی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً، آدمی کا بھروسا اپنی طاقت و قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر، اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے، اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ اُس کی رضا کو مقصود بنا کر، اُس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً، آدمی کو اُن وعدوں پر پورا بھروسا ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عملِ صالح کا رویّہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں، اور انہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اُن تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں، اور اُن سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ توکّل کے معنی کی اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے، اور اُس کے بغیر جو ایمان محض خالی خولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو اُس سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں،[۶۱] ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے

سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

[۵۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، صفحات ۳۴۶-۳۴۷-۵۹۸-۵۹۹-

جلد دوم، ص ۵۶۶۔ نیز سورۂ نجم، آیت ۳۲۔

[۵۹] یعنی وہ غضیل اور جھلّے نہیں ہوتے، بلکہ نرم خُو اور دِھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سرشت انتقامی نہیں ہوتی بلکہ وہ بندگانِ خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو اسے پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے جسے قرآن مجید میں نہایت قابلِ تعریف قرار دیا گیا ہے (آلِ عمران، آیت ۱۳۴) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے (آل عمران، ۱۵۹)۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ما انتقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہ فی شیئ قط الا ان تنتہک حرمۃ اللہ (بخاری و مسلم)، "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حرمتوں میں سے کسی حرمت کی ہتک کی جاتی تب آپ سزا دیتے تھے۔"

[۶۰] لفظی ترجمہ ہوگا "اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں"، یعنی جس کام کے لیے بھی اللہ بلاتا ہے اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔

[۶۱] اس چیز کو یہاں اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۂ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اُس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو اُن کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبّر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقلِ کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو اُن میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمّہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اُسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اِس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو اُن سب کو، یا اُن کے اپنے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریکِ مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے، اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمّہ داری نہ آ پڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اُس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرزِ زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں بھی شریکِ مشورہ کیا جاتے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو اُن میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریکِ مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو اُن کو چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابلِ اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اُسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اِس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اُس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اُس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیّت کی خرابی سے ملوث ہو، اور اِس خواہش کے ساتھ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَيۡنَهُمۡ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور خلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے، اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَيۡنَهُمۡ کا قاعدہ خود اپنی نوعیّت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اوّل یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انہیں اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں، اور انہیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر اُن کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بے ایمانی ہے جسے کوئی شخص بھی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمّہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے، اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکّاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیئے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوتے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہو گی نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے، یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶۲]، اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں[۶۳]۔

سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصولِ شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختارِ کُل نہیں ہے بلکہ لازماً اُس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"، اور "تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو"۔ اس قاعدۂ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اِس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اُس پر عملدرآمد کس طریقہ سے کیا جائے تاکہ اُس کا منشا ٹھیک طور سے پُورا ہو، لیکن اِس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

[۶۲] اس کے تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جو رزقِ حلال ہم نے انہیں دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات پُورے کرنے کے لیے مالِ حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق کو سینت کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ جو رزق انہیں دیا گیا ہے اُس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ہی ذات کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔ پہلے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رزقِ حلال و طیّب ہی کو "اپنے دیے ہوئے رزق" سے تعبیر فرماتا ہے، ناپاک اور حرام طریقوں سے کماتے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ دوسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق انسان کو دیتا ہے وہ خرچ کرنے کے لیے دیتا ہے، سینت سینت کر رکھنے اور اس پر مارِ زریں کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں دیتا۔ اور تیسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ خرچ کرنے سے مراد قرآن مجید میں محض اپنی ذات پر اور اپنی ضروریات پر ہی خرچ کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں اِنفاق فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ انہی تین وجوہ سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو یہاں اہلِ ایمان کی اُن بہترین صفات میں شمار فرما رہا ہے جن کی بنا پر آخرت کی بھلائیاں انہی کے لیے مختص کی گئی ہیں۔

[۶۳] یہ بھی اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے[۶۵]، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اُس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے[۶۶]، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۶۷]۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں اُن کو ملامت

جباروں کے لیے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ اُن کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں اور جب کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں اُن پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

[۶۴] یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیتِ ماسبق کی تشریح کے طور پر ہے۔

[۶۵] یہ پہلا اصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی برائی وہ اس کے ساتھ کر لے، اُس سے زیادہ برائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

[۶۶] یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمہ ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

[۶۷] اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک برائی کے بدلے میں اُس سے بڑھ کر برائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔[۶۵] ع

ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اُس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینہ انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زنا کرے۔

[۶۵] واضح رہے کہ اِن آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اُس وقت عملاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سروسامان پا کر تم آپے سے باہر ہوتے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے، بلکہ اصل دولت یہ اخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمھارے ہی معاشرے کے اِن مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

© rasailojaraid.com